हिन्दी पुरस्कार वितरण समारोह
हिन्दी विभाग
नई दिल्ली नगरपालिका परिषद्

کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو نے ۲۶ ستمبر ۲۰۱۳ء کو کونسل کے صدر دفتر میں منعقد جلسہ میں ہندی مقابلہ جاتی پروگراموں میں حصہ لینے والے ۲۴ کامیاب طلبا کو انعام سے نوازا۔ شعبۂ ہندی کے ذریعہ منعقد مختلف مقابلہ جاتی پروگراموں میں تقریباً ۵۰۰ سے زیادہ افسران وکارکنان نے حصہ لیا۔

نئی دلّی میونسپل کونسل

# کونسل کی سرگرمیاں

۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء دہلی کی وزیرِ اعلیٰ محترمہ شیلا دِکشت نے بھارتی نگر میں سیمنٹ۔کنکریٹ روڈ بنانے کا منصوبہ بی۔کے۔دت کالونی میں سڑکوں کے جدیدکاری منصوبہ اور بی۔کے۔دت کالونی کے ڈی اور اِی بلاک میں بلڈنگ اصلاحی منصوبہ کا سنگِ بنیاد رکھا۔اس موقع پر کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو،کونسل کے نائب صدر محترمہ تاجدار بابر،کونسل کے رکن جناب آئی۔اے۔صدّیقی اور جناب سوکارام ومقامی لوگ موجود تھے۔

کونسل کے شعبۂ تعلیم کی طرف سے ''عملی تربیت سے ہی بچوں میں تخلیقی ارتقا'' عنوان کے تحت ۸؍اکتوبر ۲۰۱۳ء سے ۱۲؍اکتوبر ۲۰۱۳ء تک ایک کیمپ کا انعقاد کیا گیا جس میں ۸؍اسکولوں کے تقریباً ۲۰۰؍طلبا نے حصہ لیا۔یہ پروگرام ڈائریکٹر (شعبۂ تعلیم) محترمہ وِدوشی چترویدی کی سرپرستی میں کیا گیا۔

# کونسل کی سرگرمیاں

۲۲ر ستمبر ۲۰۱۳ء محترمہ شیلا دِکشت وزیرِ اعلیٰ دہلی حکومت نے پھل اور سبزی فروخت کرنے کے لیے بیٹری سے چلنے والی گاڑیوں کو مندر مارگ پر ہری جھنڈی دِکھا کر اس کی شروعات کی۔

۲۴ر ستمبر ۲۰۱۳ء کو پرانہ قلعہ روڈ پر واقع اسکول آف گارڈننگ میں کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو نے جنوبی دہلی نگر نِگم کے ۳۶۰ مالیوں کے لیے منعقد تربیتی پروگرام کا افتتاح کیا۔

نئی دلّی میونسپل کونسل

# کونسل کی سرگرمیاں

۱۴ر ستمبر ۲۰۱۳ء کو لکشمی بائی نگر میں ایک پارک کا افتتاح کرتے ہوئے دہلی کی وزیرِ اعلیٰ محترمہ شیلا دِکشت ۔کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو ،کونسل کے رکن جناب سوکارام، کونسل کے سکریٹری جناب وِکاس آنند اور ممتاز افسران موجود تھے۔

۲۱ر ستمبر ۲۰۱۳ء کو لودھی گارڈن میں پبلک آرٹ کا معائنہ کرتے ہوئے دہلی کی وزیرِ اعلیٰ محترمہ شیلا دِکشت ساتھ میں کونسل کے صدر عالیجناب جلج شریواستو، کونسل کے ممتاز افسران اور صبح میں چہل قدمی کرنے والے لوگ۔

**مصنّفین سے درخواست**

اپنی تحریر صاف ستھرے حروف میں لکھ کر یا ٹائپ کروا کر بھیجیں۔

# غزلیں

مناظر حسن شاہین

تھی بہ ظاہر تو بہت سہل و سادی مٹی
نکلی اب میرے تصور سے بھی گہری مٹی

میں پوچھا کہ وطن سے ہے محبت کتنی؟
اس نے بس چوم کے ماتھے سے لگالی مٹی

ٹوٹتا ہی نہیں ان مست ہواؤں کا خمار
بھولتی ہی نہیں گاؤں کی نشیلی مٹی

پہلے ہی بارِ گنہ سے ہوں دبا کیسے کہوں؟
قبر پر ڈالیے آہستہ سے ہلکی مٹی

آدمی کے لیے دو گز زمیں کافی ہے
اے ہوسِ کار! تجھے چاہیے کتنی مٹی؟

رہ کے پردیس میں آنکھوں سے لگاؤں گا اسے
مجھ کو دے دو مرے آنگن کی ذرا سی مٹی

عزتِ نفس ہے عورت کے لہو میں شامل
کاش! پامال نہ ہو گھر کی یہ آدھی مٹی

حسبِ خواہش جو بنانا ہے بنالے شاہیںؔ
میرے فنکار! کہاں پائے گا ایسی مٹی

☆☆☆

ظلمتوں کو یوں جگمگائیں گے
دوستو! شمعِ دل جلائیں گے

آپ تو بس گئے ہیں سانسوں میں
آپ کو کیسے بھول پائیں گے

ہاں! ہمیں تیرنا نہیں آتا
تیری آنکھوں میں ڈوب جائیں گے

شعر پر داد مل تو جائے گی
اپنے بچوں کو کیا کھلائیں گے

آپ نے خود کو جب نہیں بدلا
آپ کیا انقلاب لائیں گے

ہر خوشی آپ کو مبارک ہو
ہنس کے ہم بارِ غم اٹھائیں گے

خارزاروں میں، دیکھنا شاہیںؔ
پیار کے پھول ہم کھلائیں گے

☆☆☆

مڈل اسکول، لکشمی پور، وایا چاکند، ضلع گیا، بہار 804404

# نیا آسمان (نظم)

اطہر حسن اطہر

رنگ آلود ہو رہا ہے
دن بدن یہ آسماں
ماند پڑتی جا رہی ہے
سورج کی اپنی روشنی
کہرے ستم بڑھنے لگا
دھیرے دھیرے چار سو
سچ کے سائے بھی اوجھل ہوئے
جو رہتے تھے میرے روبرو
دعاؤں کی تمازت کا بھی دور خالی ہوا
اب بھٹک رہے ہیں
سو طیبہ سے ہم
کون جانے
کب چھٹے
یہ کہرے ستم
طیبہ کو ہوں پھر سے گامزن
کاش!
آئے اب کوئی پھر پیمبر یہاں
چاک کر ڈالے
اس کہرے ستم کو
دے ہمیں سورج کی نئی روشنی
اور اک نیا آسماں.........

☆☆☆

147/A، گلی نمبر ۷، جعفر آباد، دہلی ۔۵۳

# غزل

(ظفر علی ظفر)

مکانِ شوق میں دیوار و در نہیں رکھتے
ہم اپنے دل میں ہواؤں کا ڈر نہیں رکھتے

جہاں میں خانہ بدوشوں کی طرح رہتے ہیں
سرائے فانی میں ہم کوئی گھر نہیں رکھتے

دیارِ دشت و دمن ہی ٹھکانہ ہے اپنا
جنوں کی راہ میں کوئی نگر نہیں رکھتے

چلو دکان ہی بازار میں لگاتے ہیں اب
کہ عصرِ نو میں کوئی بھی ہنر نہیں رکھتے

فضائے شوق میں پرواز کی تمنا ہے
اگرچہ بازوؤں میں کوئی پر نہیں رکھتے

ہمارے جستجو میں رہتا ہے ہمارا عدو
ہمارے یار ہماری خبر نہیں رکھتے

گرادیں گے جنوں میں کوہ بے ستون ظفرؔ
خبر غلط ہے کہ کوئی جگر نہیں رکھتے

☆☆☆

اردو دربار، رحمانیہ اسکول اسٹریٹ، آسنسول ۔۲
(مغربی بنگال) پن کوڈ ۔۷۱۳۳۰۲

# غـــزلیں

## سیدہ شان معراج

☆

کیا دیکھتا ہے حال کے منظر ادھر بھی دیکھ
ماضی کے نقش یاد کی دیوار پر بھی دیکھ

دیکھے ہیں میرے عیب تو میرا ہنر بھی دیکھ
سودا ہے جس میں اپنی انا کا وہ سر بھی دیکھ

لے کام مجھ سے سخت اُڑانوں کا تو مگر
پہلے مری نگاہ مرے بال و پر بھی دیکھ

چہرے کے رنگ و نور کو میرا ہنر سمجھ
مجھکو مری نظر سے کبھی جھانک کر بھی دیکھ

اک بار اور بیچ کے زمانے کی آنکھ سے
ہوں دیکھنے کی چیز تو بارِ دگر بھی دیکھ

○■○

تاریں ٹکلی، شاہجہانپور۔۲۴۲۰۱۱

## ظفر علی ظفر

☆

پروں کو کھول کے آزاد کر کے دیکھنا ہے
پرندوں کو کبھی صیاد کر کے دیکھنا ہے

پرندہ جنوں آزاد کر کے دیکھنا ہے
جہانِ شوق کو برباد کر کے دیکھنا ہے

ہے آرزو صف فرہاد و قیس میں رہوں میں
جنون نو کوئی ایجاد کر کے دیکھنا ہے

مسرتوں کی فضا میں سفر ہے آج تلک
کبھی کبھی اسے ناشاد کر کے دیکھنا ہے

ابھی تلک ہے وہی تیزی دھڑکنوں میں کیا
کبھی فسانۂ دل یاد کر کے دیکھنا ہے

ہمیں پتہ ہے کہ دار و رسن ملیں گے مگر
ہمیں بغاوت الحاد کر کے دیکھنا ہے

میری خوشی میں وہ شامل ابھی بھی ہے کہ نہیں
پھر اپنے دل کو ظفرؔ شاد کر کے دیکھنا ہے

☆☆☆

اردو دربار، رحمانیہ اسکول اسٹریٹ، آسنسول۔۲
(مغربی بنگال) پن کوڈ۔۷۱۳۳۰۲

# غزلیں

## اوج اکبرپوری

(۱)

بلا سے منظر شام و سحر ملے نہ ملے
نکل پڑا ہوں کوئی ہمسفر ملے نہ ملے

چلے چلو کہ ابھی سو رہے ہیں سب کانٹے
کہیں پھر ایسی تمھیں رہ گذر ملے نہ ملے

گریباں چاک کرو اور نکل پڑو گھر سے
اٹھو کہ پھر تمھیں اذن سفر ملے نہ ملے

وفا کی راہوں میں جی بھر کے دوستو پی لو
پھر اس کے بعد یہ خون جگر ملے نہ ملے

جو حال دل تمھیں کہنا ہے کہہ دو قاتل سے
نظر سے پھر کہیں تیر نظر ملے نہ ملے

بچا کے رکھنا انھیں کام آئیں گے اک دن
یہ شعلہ بار رہوا یہ شرر ملے نہ ملے

نمونہ خُلق کا طیبہ میں دیکھ لو اے اوجؔ
جہاں میں پھر کوئی ایسا بشر ملے نہ ملے

(۲)

ابھی تو سامنے ہے فکر و آگہی کا سفر
خزاں کے بعد ہے پھولوں کی تازگی کا سفر

انا کو قابو میں رکھنا ہے عین خوش بختی
یہیں سے ہوتا ہے انسان کی خودی کا سفر

ہر ایک گام پہ کرب و بلا کا منظر ہے
ہے امتحانِ مسلسل یہ زندگی کا سفر

دماغ و دل ہے مکدر فضا ہے آلودہ
ادھر بھی ہو مرے مولا کسی ولی کا سفر

اندھیرو! ہوش میں آؤ مزاج کو بدلو
کہ ہونے والا ہے دنیا میں روشنی کا سفر

دعا ہے اوجؔ کی جاری رہے سدا یونہی
ادب نوازوں کی تخلیق شاعری کا سفر

اکبرپور رہتاس (بہار) ۸۲۱۳۱۱

# غزلیں

## منظور پروانہ

ہم اپنے عشق کا اظہار کرنا چاہتے ہیں
خطا ہے تو خطا سو بار کرنا چاہتے ہیں

یہاں جینا بھی اب دشوار کرنا چاہتے ہیں
کرم ہم پر ہمارے یار کرنا چاہتے ہیں

ہیں ربط باہمی میں مرحلے ہر گام حائل
کشادہ ظرف سے ہموار کرنا چاہتے ہیں

لگا کر ہر نفس، ہر گام اپنی بندشیں وہ
ہمیں جینے سے ہی بیزار کرنا چاہتے ہیں

سفر طے ہو رہا تھا شادمانی کی فضا میں
مگر حالات اسے آزاد کرنا چاہتے ہیں

سنی جاتی نہیں مظلوم کی فریاد جب کوئی
اسے ہم زینت اخبار کرنا چاہتے ہیں

بضد کب سے ہے پروانہؔ سو کہنا مان کر دل کا
ذرا مدحِ لب و رخسار کرنا چاہتے ہیں

☆☆☆

چکن شاپ، نظیر آباد، لکھنؤ۔۱۸

## ڈاکٹر اظہار مسرت یزدانی

پس منظر سلوک کا دل پر ہوا اثر
منظر تو صاف آیا ہے ہر آنکھ کو نظر

ہر غم کو جھیلنا ہے تبسم بہ لب مجھے
شِو نے پیا تھا وِش بھی سمندر کو منتھ کر

دل میں رہی جو بات وہ کوٹھوں نہ چڑھ سکی
افواہ بن گئی تو پھیل گئی ہر خبر

کیوں گنگنائی آپ نے پھر اَن کہی غزل
نا معتبر ہوا وہی غم تھا جو معتبر

کمپیوٹر حیات کی قدروں پہ ہے محیط
خوابوں کا بھی سفر ہے سرابوں کے دوش پر

پتھر وہی ہوا تو تجسس ضمیر تھا
بے حس تو روندتا رہا پارینہ رہگذر

اے بے نیاز! میں بھی تو دریوزہ گر نہیں
لے تیرے در پہ ثبت کیا میں نے اپنا سر

باشندگانِ کنج قناعت ہیں ہم میاں
دیوار و در کی قید سے آزاد ہے یہ گھر

تم نے تو آئینہ کی ادا سیکھ لی ہے نا؟
رکھ لینا میری یاد کو دل میں اتار کر

ہے جیب میں قلم تو قلم میں ہے اختلاج
کرنا پڑیگا سوچ کو کاغذ پر مشتہر

اظہار کر رہا ہوں مسرت کا بزم میں
تنہائیوں میں دے گی مرا ساتھ چشم تر

برکاتی دواخانہ، ۱۴۸، رام گنج بازار، جے پور۔۳۰۲۰۰۳

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

اسی کا فائدہ اٹھا کر وہ ان جذبات کا اظہار کرتے ہیں؛

ہر سال بہار آئے گی کھل جائیں گے سب گل
سرسبز جوانان چمن ہونگے بیا کل
سبزہ کہیں ہوگا کہیں نسریں کہیں سنبل
وہ سرد ہوائیں وہ خوش الحانیِ بلبل
دنیا کے نہ بستاں فرح ناک میں ہوگے
گل باغ میں تم زیر زمیں خاک میں ہوگے

انیسؔ ڈرامائی انداز میں کسی مہیب منظر خصوصاً قتال کو پیش کرنے سے قبل ناظرین کے نازک جذبات اور جمالیاتی حِس کو ابھارتے ہیں اور اس کے پس منظر میں اندوہناک واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے اس کی ہولناکی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

میر انیسؔ کے کلام کی یہی خوبی ان کے کلام کو قدما اور ان پیش روؤں سے منفرد کرتی ہے۔ بیشک انیسؔ کا یہ دعویٰ اپنی جگہ بالکل درست ہے؛

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

گلفشاں 61/A، سول کالونی
کلمنا روڈ، کامٹی ۔۴۴۱۰۰۲ (ضلع ناگپور)

# غزل

(منظور پروانہ)

کوئی اپنے آپ سے اتنا خفا ہوتا نہیں
مدتیں گذریں کہ خود سے رابطہ ہوتا نہیں
پیکر فانی میں رہ کر بھی فنا ہوتا نہیں
مرنے والا کوئی بھی بے تذکرہ ہوتا نہیں
دل سے جب تک دل نہ مل جائے رہیں گی دوریاں
یوں بظاہر درمیاں کچھ فاصلہ ہوتا نہیں
حق نوائی سے مری ہے شہر بھی کو اتفاق
پھر بھی بالا علان کوئی ہم نوا ہوتا نہیں
اقتدارِ چند روزہ پر نہ اترا نہ کبھی
منصب و رتبہ کسی کا دیرپا ہوتا نہیں
رفتہ رفتہ آ گیا مجھکو سلیقہ ضبط کا
درد اٹھتا ہے مگر حد سے سوا ہوتا نہیں
ہم بھی پروانہؔ خدا اک شمع رخ پر ہیں مگر
روبرو جانے کے اسکے حوصلہ ہوتا نہیں

☆☆☆

چکن شاپ، نظیر آباد، لکھنؤ۔۱۸

ہندوستان کے کسی علاقے میں محسوس کرتا ہے۔ ایسے مناظر کی منظر کشی اور اس کی جزئیات کی تفصیل اتنی آسان نہیں تھی۔ یہ مرحلہ بڑا دشوار گزار تھا اسی لئے میر انیس نے بجا طور پر اپنی تعلّی کا اظہار کیا ہے۔ گویا وہ آنے والوں کے سامنے چیلنج رکھ رہے ہیں۔

قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

ان کی زبردست بیانیہ، رفعت، ذہنی تصویریں، جذباتی کیفیات کا اظہار زبان و الفاظ پر ان کی گرفت، اثر آفرینی، الفاظ کے مناسب انتخاب نے ان کے مراثی کو منفرد بنا دیا ہے۔ ان کے کلام میں جا بہ جا یہ مثالیں بکھری ہوئی ہیں۔

شب عاشور گزرنے کے بعد جب یوم شہادت کی صبح نمودار ہوتی ہے تو انیس اس کا منظر اس دلآویز انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری خود کو اس فضا میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ لکھتے ہیں:

وہ صبح اور وہ چھانوں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو عش کرے ارنی گوے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادی سینا سا س سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

اور یہ منظر کشی دیکھئے:

آتی تھی درندوں کی صدا گونجتے تھے شیر
سب فرش پہ آندھی سے خس و خاک کا تھا ڈھیر
گل ہونے میں شمعوں کے نہ لگی ذرا دیر
کرتی تھی اندھیرے میں ہوا اور بھی اندھیر
جب اٹھتی تھیں چوبیں تو جھکا جاتا تھا خیمہ
بھرتی تھی ہوا جب تو اڑا جاتا تھا خیمہ

ایک دوسرے مرثیے کی ابتداء یوں کرتے ہیں:

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں سے دم بدم
مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

بظاہر ریگستان میں موسم کی یہ رنگینی، شیروں کی آمد عقل و قیاس سے دور محسوس ہوتی ہے، مگر اس کا بھی جواب دیا جا چکا ہے کہ مقامی اثر پیدا کرنے کے لئے اس شاعرانہ آزادی کا استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ہندوستان کے قارئین ان کرداروں اور اُن واقعات سے خود کو نزدیک محسوس کرتے ہیں۔ یہ انیس کا ہی کمال ہے کہ انھوں نے محض جذباتی عقیدت کے باوجود دیگر پڑھنے والوں کو کربلا کے واقعات سے قریب کر دیا۔ خود ان کا یہ دعویٰ ہے کہ:

# میر انیس کے کلام میں منظر نگاری

ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی

اردو مرثیہ نگاری کے میدان میں میر انیسؔ کا نام بڑے ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس ادبی میدان میں انھوں نے وہ خدمات انجام دیں کہ مرثیہ کو 'ادب العالیہ' کے درجے پر پہنچا دیا اور مرثیہ گویوں سے اس کلنک کو دھو دیا کہ ''بگڑا ہوا شاعر مرثیہ نگار بن جاتا ہے''

گو کہ کربلا کا واقعہ بڑا مختصر ہے اور اس کے کردار بھی گنے چنے ہیں اس لئے شاعر کو اپنی مہارت دکھانے کے مواقع بہت کم ہیں۔ مذہبی عقیدت کے تئیں سارے کردار ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں جن کی شخصیات اور کرداروں میں اتار چڑھاؤ کی گنجائش کم ہوتی ہے مگر انیس نے ان پابندیوں کے باوجود مرثیہ گوئی کے میدان میں وہ کارنامے انجام دیے کہ لوگ غزلیہ شاعری کو بھول گئے اور ان کی شعری صلاحیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے حالانکہ انیسؔ نے غزل گوئی بھی کی مگر بہت جلد مرثیہ گوئی کی طرف ملتفت ہو گئے ورنہ شاید وہ بھی دیگر متغزلین کی طرح فراموش کر دیے جاتے۔ انیسؔ سے قبل اردو میں جو سلام، نوحے اور مرثیہ کہے جاتے تھے ان کے پیچھے مذہبی عقیدت پوشیدہ ہوتی تھی نیز بینیہ حصوں پر زور دیا جاتا تھا جس کا واحد مقصد اہل مجلس کو رونے پر مجبور کرنا ہوتا تھا تا کہ ان کے جذبات کو ابھارا جا سکے اور آخرت کا سامان کیا جا سکے مگر انیس نے اپنے بے مثل مراثی سے اس تصور کو یک لخت بدل کر رکھ دیا۔ اپنے پیش رؤں کے لئے انھوں نے قیادت کا فریضہ انجام دیا۔

میر انیسؔ کا کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے مراثی کے لئے مسدس کے فارم کو مخصوص کر دیا۔ انھوں نے رثائی کلام میں کردار نگاری، جزئیات کی تفصیل، واقعہ نگاری، انسانی جبلت اور انسانی فطرت و نفسیات کے مطالعہ و مشاہدہ کو اولیت بخشی اور اپنے محسوسات کو زبردست قوت تخیلہ، خلاقیت اور موزوں زبان و بیان کی مدد سے کچھ اس طرح بیان کیا کہ چلتی پھرتی تصویریں نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ زبان پر ان کی گرفت، الفاظ کی دروبست، مناسب و موزوں الفاظ اور تراکیب کے انتخاب نے ان کے کلام کو اوروں سے الگ بنا دیا ہے۔ ان کی قوت تخیل اور خلاقیت، مناسب تشبیہات واستعارات ان جہانوں کی سیر کراتی ہے جہاں ایک عام آدمی یا معمولی شعروسخن کا ذوق رکھنے والے فرد کا ذہن نہیں پہنچ سکتا۔ غرضیکہ انیس نے وہ راہ اختیار کی جس کا تتبع ناممکن ہے۔

میر انیسؔ کے کلام (مراثی) کی ایک خوبی ان کے بے پناہ منظر کشی کی صفت ہے۔ وہ اپنے خیالات کو پیش کرنے کے لئے ایسے الفاظ کا اور اس ترتیب سے استعمال کرتے ہیں گویا سننے یا پڑھنے والا اسے نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ سرزمین عرب کا بے آب و گیاہ میدان کربلا، ہندوستان جیسے سرسبز و شاداب علاقے کے جنگلات، پانی کے ذخائر، حیاتی تنوع اور جنگلی جانوروں سے بظاہر عاری ہے مگر انیس نے اپنی قوتِ تخیلہ کی بدولت قدرتی مناظر و مظاہر کی وہ تصویر کشی کی ہے کہ اردو کا قاری خود کو

# غزل

## (اظہر نیّر)

(۱)

میرؔ جیسی دل سے نکلی شاعری لگنے لگی
یہ میری ہر اک غزل میں سادگی لگنے لگی

زندگی تاریک تھی جب تک کہ نہ آئے تھے وہ
اب دلِ ظلمت نشیں میں روشنی لگنے لگی

کس لئے مجھ سے خفا ہے تو بتا دے یہ خدا
آفتِ دل اب تو تیری بے رخی لگنے لگی

ان کے بام و در کو تکتے ایک مدت ہو گئی
اب تو اپنے آپ سے شرمندگی لگنے لگی

کون سیلابِ تباہی روکنے پائے گا اب
نقرئی دیوار جبکہ آہنی لگنے لگی

ماں کی خیریت کا اے نیّرؔ وقت نہ حاصل ہوا
ٹھوکریں کھاتی ہوئی یہ زندگی لگنے لگی

(۲)

یوں ذرا سی بات پر تکرار ہے
بھائی کے آنگن میں اک دیوار ہے

خوف کی زنجیر میں جکڑے ہوئے
بزدلوں کے ہاتھ میں تلوار ہے

بوجھ سر پر اور تھکن برسوں کی ہے
راہ منزل کی بہت دشوار ہے

تم سے دوری تھی تو فرقت کا تھا غم
تم سے مل کر جی میرا بیزار ہے

مٹیوں کے ڈھیر سے مٹی ملی
عمر بھر کی جستجو بیکار ہے

غم کا نیّرؔ ہو مداوا کس طرح
کوئی محسن اور نہ غم خوار ہے

☆☆☆

برہولیا، وایان کنسی سمری، ضلع دربھنگا۔ ۸۴۷۱۰۶، بہار (انڈیا)

# غزلیں

**ڈاکٹر مسعود جعفری**

## (۱)

تو مجھے کنول جیسی یا غزل سی لگتی ہے
اس سَلم میں رہ کر بھی اک محل سی لگتی ہے

گھُپ اندھیرا پھیلا ہے سب بھٹکتے جائیں گے
صبح نو کی منزل بھی ایک پل سی لگتی ہے

روح کا یہ شیشہ بھی دُھل کے صاف ہو جائے
آنسوؤں کی بارش بھی پاک جل سی لگتی ہے

اس کے ساتھ چلنے سے معجزے بھی ہوتے ہیں
بات بھی پرانی سی آج کل سی لگتی ہے

وہ پری محلّہ کی دل پہ راج کرنے سے
اس کے خواب کی تعبیر اب سرل سی لگتی ہے

کس طرح چڑھینگے ہم پاؤں میں تو چھالے ہیں
زندگی کی اونچائی اک جبل سی لگتی ہے

گل رخوں کے آتے ہی جعفریؔ چلے آئے
گاؤں کی ندی اپنی جھیل ڈل سی لگتی ہے

☆☆☆

مکان نمبر 8-1-43/1/A/1/5 پوسٹ شیخ پٹ،
حیدرآباد۔500 008 (A.P.)

## (۲)

زلفیں اڑیں جو آپ کی شام غزل ہوئی
قسمت کھلی فقیر کی کٹیا محل ہوئی

ورنہ مرے لئے تو معمہ بنی رہی
تجھ سے سنی تو ساری کہانی سرل ہوئی

وہ تو کہیں چلی گئی آئی نہ میرے گھر
شرمندہ بار ہا تو ہماری اجل ہوئی

تاریخ کے حساب سے بہتا رہا لہو
تاریخ کے حساب سے جنگ جمل ہوئی

آئی تمہاری یاد تو کھلنے لگے گلاب
ایسا لگا کہ ایک صدی ایک پل ہوئی

ورنہ رکھی ہوئی تھی ادھوری ہی طاق میں
دیکھا تمہارا رخ تو مکمل غزل ہوئی

اک دشت بھی تمہارے قدم سے ہرا ہوا
اک جھیل میں تمہاری ادا بھی کنول ہوئی

دریا بھی کھل گیا ہے چلو لوٹ ہی چلیں
ضرب عصا بھی ساتھ تھی راہ عمل ہوئی

اس کی بس ایک دید بھی نعمت تھی جعفریؔ
اس سے ذرا سی بات بھی روز ازل ہوئی

☆☆☆

مکان نمبر 8-1-43/1/A/1/5 پوسٹ شیخ پٹ، حیدرآباد۔500 008 (A.P.)

## کھانی

# راجہ بیٹا

(بلوندر بالم)

پاپا ٹھیک ٹھاک ہو؟ ہاں بیٹا! ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تم سناؤ بیٹا ٹھیک ٹھاک ہو۔ ہاں پاپا ٹھیک ہی ہوں۔ لیکن پاپا کیسے ٹھیک ہوں مجھے اب کوئی یاد نہیں کرتا۔ آپ نے تو مجھے بھلا ہی چھوڑا ہے۔ آپ مجھے بہت پیار کرتے تھے ناں۔ آپ بھی تو اب مجھے یاد نہیں کرتے۔ میں تجھ سے بہت دور چلا گیا ہوں۔ اسی لیے اب مجھے کوئی یاد نہیں کرتا۔ آپ مجھے کتنی چیزیں لا کر دیتے تھے۔ روز مجھے پیار کرتے تھے۔ میرے ساتھ کھیلتے تھے۔ میں تو اب اکیلا ہوں پاپا۔ آپ تو سب ہنستے کھیلتے ہو۔ مجھے کیوں نہیں یاد کرتے پاپا۔ ڈیڈی بھی اب مجھے یاد نہیں کرتے پاپا۔ ممی بھی مجھے یاد نہیں کرتی۔ منی ویر ٹھیک ٹھاک ہے ناں۔ وہ بھی یاد نہیں کرتا۔ سیتا دیدی کو تو میرا خیال ہی بھول گیا ہے۔ پاپا مجھے پتہ ہے کہ ڈیڈی نے بڑی کوٹھی بنالی ہے۔ نئی کار بھی لے لی ہے۔ کوٹھی میں میرا کوئی کمرا نہیں بنایا۔ میں تو ڈیدی کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہتا ہوں پاپا۔ پاپا پرانے گھر میں یہاں میں کھیلا کرتا تھا میں وہاں ہی ہوں میں پاپا۔ آپ کے کمرے میں رہتا ہوں۔ جب بھی آپ گھر آتے ہو۔ میں آپ کو اُسی طرح ہی دیکھتا ہوں۔ لیکن آپ مجھے پیار ہی نہیں کرتے۔ میرے ساتھ کھیلتے نہیں۔ اب آپ دروازے میں کھڑے ہو کر آواز دے کر مجھے نہیں بلاتے۔ جس طرح بلایا کرتے تھے آجا میرا راجہ بیٹا۔ کہ میں آپ سے دور چلا گیا ہوں میں آپ کا حصہ نہیں۔ جو بچے دور چلے جاتے ہیں کیا ماں باپ اُس کو بھول جاتے ہیں کتنے مطلبی ہو گئے ہیں ماں باپ آج کل پاپا۔ منی ویر کا ہر سال جنم دن مناتے ہو۔ سیتا دیدی کا جنم دن مناتے ہو۔ مجھے تو کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ میں سب کچھ دیکھتا ہوں۔ پرنسو ویر کاویر بھی مجھے یاد نہیں کرتے۔ مماں (تائی) نے بھی کبھی یاد نہیں کیا۔ دادا دادی کو بھی میری یاد نہیں آتی۔ اُن کو بہت کام ہیں۔ پاپا جی۔ جو بچے دور چلے جاتے ہیں اُن کا ممی ڈیدی، رشتے دار اور گھر پریوار میں کوئی حق نہیں ہوتا۔ اُن کو یاد نہیں کیا جانا چاہئے۔ پاپا میں اکیلا ہوں پر آپ کے پیارے آشرواد کے صدقہ آپ کے دلوں میں زندہ رہوں گا۔ لیکن آپ مجھے نہ بھلاؤ۔ میرا بھی جنم دن منایا کرو۔ جس دن میں آپ سے دور گیا تھا۔ اُس دن ہر سال مجھے یاد ضرور کیا کرو۔ میرا بھی جنم دن منایا کرو پاپا۔ جب آپ مجھے یاد کیا کرو گے تو اُس وقت مجھے سکون ملا کرے گا۔ پاپا یادیں بھی زندگی کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ یادوں کا جسم نہیں ہوتا لیکن جسم سے بڑھ کر پیار کرتی ہیں۔ ایک یادیں ہی ہوتی ہیں جو جسم کی حدود وغیرہ کو نہیں ناپتی۔ صرف اور صرف روح دل و دماغ کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ چلتے پھرتے رشتے دھوکا دے سکتے ہیں۔ لیکن یادیں کوئی دھوکا نہیں دیتیں۔ چلتے پھرتے رشتے ناطے اور انسان دھوکا دے سکتے ہیں۔ تکلیف دے سکتے ہیں لڑائی جھگڑے کر سکتے ہیں۔ لیکن پاپا یادیں تو کوئی دُکھ تکلیف نہیں دیتیں۔ میں اب پاپا یادوں میں ہی آپ کے ہمراہ ہوں مجھے بھلانا نہ پاپا۔ مجھے اُسی طرح پیار کرتے رہنا۔ ممی اور پاپا کو کہنا کہ مجھے بھی یاد کیا کریں۔ مجھے آپ سے جدا کر کے نہ پھینک دیں میں تو اُن کے خون کا، جسم کا اور روح کا ایک حصہ ہوں پاپا زندہ انسان دھوکہ دیتے ہیں۔ رشتے دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن پاپا یادیں دھوکا نہیں دیتیں۔ یادیں تو رب سے بات چیت کرا دیتی ہیں۔ کروڑوں میل دور بیٹھے اپنوں سے سورگ میں بیٹھے ساتھیوں کے ساتھ لیکن میں تو آپ کا بیٹا ہوں۔ راجے نے مجھ سے کافی بات چیت کی۔ ویسے ہی جس طرح وہ کیا کرتا تھا۔ راجے بیٹے کو میں پیار سے گلے سے لگا لیا۔ اور کئی دفعہ پیار سے چوما پیار کیا۔ جس طرح میں کیا کرتا تھا۔ راجہ میری گود میں بغلگیر تھا کہ میرا خواب ٹوٹ گیا۔ میں یکدم اٹھا۔ وقت دیکھا رات دو بج چکے تھے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔

(کہانی جاری.....اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

مضمون ''گھر آنگن'' کے لئے باپ سے ضروری نوٹس کا مطالبہ کرتی ہے۔ جبکہ بچی کی ماں ایسا کرنے سے شوہر کو اس لئے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر بچی کے دل و دماغ میں ایک ایسے گھر آنگن کی خواہش جاگ اُٹھی جو رنگا رنگ پھولوں سے گھرا ہوتا ہے اور جس کے پیڑ میں جھولا پڑا ہوتا ہے اور جہاں کھلے آسمان کے نیچے چاندنی راتوں میں مزے کی نیند آتی ہے تو سیمنٹ اور کنکریٹ کے اس جنگل میں وہ اسے ایسا گھر آنگن کہاں سے لاکر دینگے۔ ظاہر ہے ایسے گھر آنگن تو آجکل ماضی کا حسین خواب ہی بن کر رہ گئے ہیں۔

دوسرا افسانہ ''منزل کی تلاش'' سماج میں در آئی بدعنوانیوں، بے راہرویوں اور بے انصافی کے عام رویے پر تلملا دینے والا کاٹ دار طنز کرتا ہے اور ان بددیانت لوگوں کو اپنی لعنت و ملامت کا ہدف بناتا ہے جو اپنے وسیع اختیارات کے غلط استعمال سے حقدار کو ناحق کر کے بھائی بھتیجاواد کی بدعت کو فروغ دیتے ہیں۔ اس سماجی برائی کے اظہار کے لئے انہوں نے کہانی کا ہیرو ایک ایسے نوجوان کو بنایا ہے جس کی ہیئت کجائی پر لوگ طرح طرح کے تحقیر آمیز فقرے کستے ہیں۔ یہاں تک کہ اسے چور اچکا اور دہشت گرد تک قرار دے دیا جاتا ہے تبھی معلوم ہوتا ہے کہ حقدار ہوتے ہوئے اسے ملازمت سے محروم کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے بھائی بھتیجہ واد ہے۔ اور اُس پڑھے لکھے نوجوان کی یہ ہیئت کجائی اور درگت اس کے بے روزگاری اور مفلسی ولاچاری کے ہاتھوں بنی تھی۔

''اثر'' نام کا افسانہ ان سماج دشمن عناصر کے چہروں سے نقاب اٹھاتا ہے جو نوجوانوں کو طرح طرح کے لالچ میں مبتلا کر کے اور اپنے گروہ میں شامل کر کے انہیں مجرمانہ طرز کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس کے اظہار کے لئے پلاٹ اس طرح بنا گیا ہے کہ ماں باپ اپنے جوان بیٹے کو فوج میں کسی اعلیٰ عہدے پر دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں۔ مگر وہ میجر صاحب کے کیمپ کو چھوڑ کر جرائم پیشہ گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔ کہانی میں زبانی ہائے توبہ تو بہت کی گئی ہے مگر بیٹا کیسے گمراہ ہوا اس کی کردار نگاری سے ہاتھ اُٹھا لیا گیا ہے اس لئے کہانی ''اثر'' کسی اخباری خبر کی طرح واقعہ سے آشنا و باخبر تو کر دیتی ہے مگر اثر و تاثیر سے محروم ہی رہتی ہے۔

''پچھلی صدی کا بوجھ'' اہم موضوع پر ایک بھرپور اور جاندار کہانی ہے جس میں پختہ دلائل و براہین سے ثابت کیا گیا ہے کہ بے جوڑ شادی کی ناکامی کے حقیقی اسباب کیا ہوتے ہیں۔ کہانی کی ہیروئن اور مرکزی کردار عافیہ ہے جو پوسٹ گریجوئٹ ہے اور درس وتدریس سے جڑی ہوئی ہے خوبصورت بھی ہے مگر شادی کے پیغام سے محروم ہے۔ لہٰذا اس کی شادی ایک ٹیمپو چالک ہائی اسکول تک پڑھے ایک دقیانوسی نوجوان سے کر دی جاتی ہے جو قدم قدم پر بیوی کی ہر معقول بات کو بڑی بے دردی سے ردّ کر دیتا ہے اور کبھی کبھی تو مشتعل ہو کر اسے زدوکوب بھی کر دیتا ہے۔ یہ ذہنی فاصلہ میاں بیوی میں بعد مشرقین کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کا علاج ''ہم اس کنارے تم اس کنارے'' ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یعنی طلاق۔ طلاق۔ طلاق ''جذبات کے دائرے'' مجبوری حالات کی ایک ایسی المیہ کہانی ہے جس میں ایک باپ صاحب اولاد کہلانے کی شدید تمنا رکھتا ہے۔ مگر گھر میں حالات کی تنگی و مفلسی کے زیر نظر بیوی اس کے لئے تیار نہیں ہوتی کیونکہ آنے والے معصوم کی ان نامساعد حالات میں وہ زندگی تباہ کرنا پسند نہیں کرتی اور شوہر جب بیوی کو اپنا ہم خیال بنانے میں ناکام ہو جاتا ہے تو جذباتی ہو کر اپنا آپریشن کروا لیتا ہے۔ تاکہ بچے کی پیدائش کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے۔ ظاہر ہے یہ ایک المیہ ہے جس کے جنم داتا نامساعد حالات ہی ہیں۔ یعنی معاشی بدحالی فطری خوشیوں سے بھی انسان کو محروم کر دیتی ہے۔ نورالامین کی باقی کہانیاں بھی زندگی کی ایسی ہی سچی کہانیاں ہیں اور ان سبھی کا جائزہ لینا اس مجملی مضمون میں ممکن نہیں ہے اس لئے مضمون بند کرتا ہوں۔

---

10/1725، دہلی گیٹ، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱

# حقیقت پسند افسانہ نگار: نورالامین

(رئیس الدین رئیس)

ہمارے یہاں کچھ ایسے بھی لوگ پائے جاتے ہیں جنہیں افسانہ کی جڑیں یونانی دیو مالا، ویدک دیو مالا، کتھا، جاتک کتھا، اسطوری کہانیوں، حکایتوں الف لیلوی قصوں اور داستانوں میں نظر آتی ہیں اور مومن افسانہ نگاری کو اسی کی ترقی یافتہ شکل قرار دیتے ہیں مگر یہ محض خوش فہمی ہے۔ حقیقت جب کہ یہ ہے کہ فن افسانہ ہم نے مغرب سے ہی لیا ہے۔ اردو میں افسانے کو سجاد حیدر یلدرم، راشد اور سلطان حیدر جوش نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔ اس وقت افسانے سے پندونصائح، دینی تبلیغ اور قوم کی اصلاح کا کام لیا جاتا تھا کہ افسانہ کو خوش قسمتی سے منشی پریم چند اور سدرشن مل گئے۔ جنہوں نے افسانہ کو حقیقت پسندی سے روشناس کرایا۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں ''انگارے'' شائع ہوا جس میں رشیدہ جہاں، سجاد ظہیر اور علی احمد کے افسانوں میں پیش کردہ مذہبی توہمات پر باغیانہ خیالات نے دنیائے ادب میں ہنگامہ بپا کر دیا۔ ''انگارے'' تو ضبط کرلیا گیا اور اس کی کاپیاں نذر آتش کر دی گئیں لیکن ہمارے افسانہ نگاروں پر اس سے ایک نیا اُفق روشن ہو گیا اور پھر ترقی پسندی سے وابستہ منشی پریم چند، سدرشن، کرشن چندر، راجیندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی، اوپندر ناتھ اشک، مہندر ناتھ، عصمت چغتائی اور منٹو کا ادب پر یہ احسان عظیم ہے کہ انہوں نے افسانہ کو نقطہ عروج پر پہنچا دیا جسے افسانے کے نشاۃ ثانیہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعد میں جب ۱۹۴۰ء کے آس پاس ترقی پسندی کے روبہ زوال ہونے پر اس کے پایہ تخت پر جدیدیت متمکن ہوگئی تو کہانی میں اور واقعاتی تسلسل کے بغیر بے سروپا اور مہمل افسانے لکھے جانے لگے جن سے اکتا کر قارئین نے افسانے کو منہہ لگانا ہی بند کر دیا لہٰذا پھر سے افسانے میں کہانی واپس لوٹ آئی۔ عصر حاضر میں جو لوگ کہانی پن کے ساتھ بہترین افسانے لکھ رہے ہیں ان میں اقبال انصاری، نعیم کوثر، یاسین احمد، نور الحسنین، اشتیاق سعید، مقدر حمید، رونق جمال، مراق مرزا، سید ظفر ہاشمی، شرافت حسین، نورشاہ، دیپک کنول، دیپک بدکی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

کامیاب افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک اہم نام نورالامین کا بھی ہے وہ سادہ وسلیس زبان میں کہانی پن کے ساتھ جو افسانے لکھتے ہیں ان کے لئے مواد اور موضوعات وہ ہمارے اسی معاشرے اور اطراف کے ماحول سے مستعار لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے نہ صرف عصری منظر نامہ بلکہ ہمارے عہد کی تاریخ بھی کہلانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

ان کے افسانوں پر مبنی مجموعہ ''بند آنکھوں کے سپنے'' میں بائیس (۲۲) مختصر افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ ان افسانوں کے موبہ مو اور بالا ستیعاب (Perusal) مطالعے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ کہانی کے پہلو کو ذہن میں اُبالنے اور اچھی طرح پکا لینے کے بعد ہی اشہب قلم کو مہمیز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا افسانہ کہانی پلاٹ، واقعات کی ترتیب، مکالموں کی چستی، پختہ کردار نگاری حسب ضرورت منظر نگاری، آغاز وانجام میں ربط کا التزام واہتمام اور بیانیہ میں رنگینی ورعنائی اور غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔ وہ طویل افسانے پر دو تین صفحے کے مختصر افسانے کو ہی ترجیح دیتے ہیں تا کہ کہانی پر ان کی گرفت مضبوط بنی رہے۔ علاوہ ازیں اُن کی کہانی زندگی سے مربوط اور مقصدی ہوتی ہے۔ ان کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے وقت تازگی وتنوع اور انفرادیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اور خاص بات تو یہ بھی ہے کہ کہانی میں اول تا آخر تجسس کا سحر کہیں بھی نہیں ٹوٹتا ہے۔ قاری کو یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کے کردار اجنبی نہیں ہیں بلکہ دیکھے بھالے اور مانوس سے ہیں۔ مجموعے کی پہلی کہانی ''عنوان سے عنوان تک'' میں نورالامین نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد حاضر میں صنعتی اور تکنیکی ارتقا سے جہاں ہم نے بہت کچھ حاصل کیا ہے وہیں بہت کچھ کھو بھی دیا ہے۔ یہ بات کہنے کے لئے انہوں نے ساتویں درجے کی طالبہ اپنی بیٹی کا سہارا لیا ہے وہ اسکول کے لیے لکھے جانے والے

کرے۔آمین! دیکھئے کیا ہوتا ہے۔اگر خدانہ کرے قید ہوئے تو مجھے بھی صبر کرنا چاہئے اور خدا سے دعا کرنا چاہئے کہ مجھے اتنی قوت اپنی قدرت کا ملہ سے عطا کرے کہ کسی صورت سے بھی ظالموں سے حسرتؔ کے ساتھ بے جا ظلم کا انتقام لے سکوں۔چاہے مجھے بھی قید یا پھانسی ہو جائے''

مولانا حسرتؔ نے جو راستہ اپنایا تھا، اس سے اُن کے بہت سے دوست اور بہی خواہ بھی متفق نہیں تھے اور اسی لئے ایک وقت ایسا آیا جب مولانا بالکل اکیلے اور بے یار و مددگار ہو گئے لیکن ان حالات میں بھی نشاط النساء بیگم نے انہیں تنہا نہیں محسوس ہونے دیا اور کھل کر یوں اعلان کر دیا۔

''حسرت نے جو طریقۂ کار اپنایا ہے، اس کے پیچھے ضد اور ان کا ہاتھ ہرگز نہیں ہے۔میں نے ان کی رائے کو انتہائی صبر و سکون کی حالت میں تولا ہے۔ایسی نظر بندی سے قید بہر حال بہتر ہے۔حسرتؔ نے بہت اچھا کیا۔مجھے اُن سے یہی امید تھی''۔

بیگم حسرتؔ یعنی نشاط النساء بیگم کس قدر خود دار تھیں یہ بھی انھیں کی زبانی جانتے چلئے۔زبردست دشوار اور پر آشوب ایام میں جب جب فراخ دل اور مخیّر حضرات کی جانب سے اقتصادی مدد کی پیش کش کی جاتی، ان کی جانب سے ایک ہی جواب دیا جاتا اور وہ کچھ یوں ہوتا۔

''اگر آپ میرے شوہر کے مدّاح ہیں تو آپ کو چاہئے کہ اُن کی کتابیں خریدیں لیکن میں اقتصادی مدد قبول کرنے کے لئے بہر صورت معذرت خواہ ہوں۔''

○■○

635/547، اترسوئیا، الہ آباد۔۲۱۱۰۰۳

نئی دلّی میونسپل کونسل

# غزل

( رئیس الدین رئیسؔ)

ملے گی ہم کو نہ منزل یقیں زیادہ ہے
مسافرت کا جنوں کم زمیں زیادہ ہے

ترا لباس اگر دل نشیں زیادہ ہے
تو اپنا ذوقِ نظر بھی کہیں زیادہ ہے

نظر ٹھہرتی نہیں جھلملاتے ہیں تارے
اُسے خبر نہیں وہ خود حسین زیادہ ہے

خلوص ڈھونڈ رہے ہو تو نگروں میں میاں
یہ شے جہاں ہے غریبی وہیں زیادہ ہے

یہاں خلوص کی اُمید میں ہم آئے تھے
پتا چلا کہ تعصّب یہیں زیادہ ہے

ترے مزاج پہ کیا تبصرہ کیا جائے
ہے شبنمی بھی مگر آتشیں زیادہ ہے

جہاں سے پائی زمانے نے روشنی کل تک
جناب آج اندھیرا وہیں زیادہ ہے

یہ جس کو حالِ غمِ دل سنا رہے ہو رئیسؔ
یہ غم شناس ہے کم نکتہ چیں زیادہ ہے

○○

10/1725، دہلی گیٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۱

# نشاط النساء بیگم : ایک اولوالعزم خاتون

(احترام السلام)

کہتے ہیں ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے جو مرد کی کامیابی کے سفر میں ہر موڑ پر اس کی مددگار نظر آتی ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی کی کامیابی میں جس خاتون کا ہاتھ تھا وہ کوئی اور نہیں خود اُن کی شریک حیات نشاط النساء بیگم تھیں۔ ہم جانتے ہیں کہ مولانا حسرتؔ موہانی کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ بیک وقت مفکر، شاعر، ادیب اور صحافی ہونے کے ساتھ ہی جنگ آزادی کے مجاہد بھی تھے۔ اتنے محاذ و پر ایک ساتھ کام کرنے والے مصروف شوہر کا ایک ہمدرد اور ذمہ دار ہم سفر بن کر دکھانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن نشاط النساء بیگم نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔ انھوں نے ایک سگھڑ بیوی بن کر جہاں مولانا حسرتؔ کے خاندان کو سنبھالا اور امور خانہ داری کو بہ حسن وخوبی انجام دیا وہیں ایک محبّ وطن ہونے کے سبب جنگ آزادی کے میدان میں تن من دھن سے مصروف اپنے شوہر کا ساتھ دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

نشاط النساء بیگم کی پیدائش اُتر پردیش کے ضلع اُنّاؤ میں واقع مشہور قصبہ موہان میں ۱۸۸۵ء میں ہوئی تھی۔ مغربی تہذیب انہیں پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ تاہم مکمل طور پر ہندوستانی ماحول کی پروردہ ہونے کے باوجود ایک حوصلہ منداور بے خوف خاتون تھیں۔ انھیں اس بات کا خوب علم تھا کہ اپنی عزتِ نفس کا تحفظ کیسے کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کی ہم نوا ہی نہیں اُن کے لئے تحریک کا باعث بھی تھیں۔ راہِ حق پر ڈٹے رہنے کے لئے وہ اپنے خاوند کو ہمہ وقت جوش دلاتی رہتی تھیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں مولانا حسرتؔ موہانی ایک بیباک اور نڈر صحافی ہونے کے سبب برطانوی حکومت کی نیند حرام کئے رہتے تھے۔ نتیجتاً ان کے اپنے ذاتی پریس سے اور انھیں کی ادارت میں نکلنے والے پرچہ 'اردوئے معلّٰی' پر پابندی عائد کر دی گئی اور انھیں قید میں ڈال دیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو فطری طور پر انھیں اپنے پرچے کو دوبارہ جاری کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ لیکن اس وقت علی گڑھ میں جہاں سے ان کا پرچہ شائع ہوتا تھا۔ اس کی دوبارہ اشاعت اس لئے دشوار نظر آئی کہ وہاں کے لوگوں کے لئے یہ جانتے ہوئے کہ مولانا کو بغاوت کے جرم میں سزا دی جا چکی ہے، پرچہ کی اشاعت کے لئے تعاون کرنا اپنے لئے مصیبت مول لینے کے مترادف تھا۔ کوئی بھی مقامی پریس ان کا پرچہ چھاپنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ لیکن مولانا تو اپنی دھن کے ایک پکے شخص تھے۔ انھیں اخبار تو نکالنا ہی تھا۔ انھوں نے اپنے چھوٹے سے مکان کو ہی چھاپہ خانہ میں تبدیل کر دیا۔ چند چھوٹے بڑے پتھر یکجا کئے گئے اور اسی کے ساتھ لکڑی کا دستی پریس لگا لیا گیا۔ اس طرح 'اردو پریس' کا قیام عمل میں آیا۔ اردو پریس کے جنرل منیجر سے لے کر چپراسی تک سبھی لوگ مولانا ہی تھے۔ بے شک نشاط النساء بیگم کا تعاون انھیں ہر قدم پر حاصل رہا۔ پورے کا پورا اخبار مولانا اپنے ہاتھ سے لکھتے اور خود ہی پریس میں (Press Man) کا کام انجام دیتے۔ بیگم پیپر مین (معاون) کی طرح ان کے ساتھ لگی رہتیں۔ مشکل حالات میں بھی مولانا کے ساتھ استقلال کے ساتھ ڈٹی رہنے کے سبب نشاط النساء بیگم نے مولانا کی نگاہ میں ایک اولو العزم خاتون کا وقار حاصل کر لیا تھا۔ کیسی ہمت اور حوصلے والی خاتون تھیں بیگم حسرتؔ، اس بات کا اندازہ ان کے ایک مکتوب کی عبارت سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے حسرتؔ کے ہم خیال دوست مولانا عبدالباری کے نام لکھا تھا۔

''خدا حسرتؔ کی ہمت اور حوصلے کو بلند کرے اور جلد کامیاب

ملکی اور ملی روایات کا تعلیم سے رشتہ، نظامِ تعلیم کے باہمی تعاون واشتراک کی اہمیت، حکومت کے نصب العین اور ملت کی تعمیر میں مذہبی تعلیم کی ضرورت اور تعلیمِ نسواں کی اہمیت وغیرہ سبھی پہلوؤں پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔

اقبالؔ کے نزدیک تعلیم کا محور ابدی سچائیاں ہیں جو مذہب ہمیں فراہم کرتا ہے۔ تعلیم کا اصل مقصود معاشرے میں استحکام پیدا کرنا ہے لیکن اقبالؔ تعلیم کا مقصد معاشرے کی نمو اور ترقی بھی قرار دیتے ہیں۔ اقبالؔ نے فرد کی تخلیقی قوتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور خودی کے ارتقا پر بہت زور دیا کیوں کہ انسان کی انفرادیت ہی اس کی مکمل شخصیت ہے اور یہی شخصیت اس کی عظمت کی حامل ہے جس کی تعمیر تمام فلسفہ ہائے تعلیم کی بنیاد ہے۔ اقبالؔ کے فلسفۂ حیات کا مقصد بھی فرد کی شخصیت کی تعلیم وتربیت ہے۔ ان کا ایک جملہ ان کے تعلیمِ نسواں کی ترجمانی کرتا ہے کہ ''عورت حقیقت میں تمام تمدن کی جڑ ہے''

اقبالؔ معاشرے کی تشکیل میں عورت کی بنیادی رویہ کا ذکر کرتے ہیں اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عورت یہ کارنامہ شادی کے بعد ''ماں'' بن کر ہی انجام دیتی ہے۔ یہ قول ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ ماں کے پاوں کے نیچے جنت ہے۔ آدمی کا یہ فرض ہے کہ وہ خواتین کی عزت کرے ورنہ کارِ زندگی ناتمام رہ جائیگا۔

اقبالؔ تعلیمِ نسواں کے پُرزور حامی ہیں۔ وہ تو عورت کی تعلیم کو مرد کی تعلیم سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ وہ عورت کو تمدن کی جڑ قرار دیتے ہیں اور اسی لیے اس کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فرد کی تعلیم ہے، مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی، اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہلِ مطلق رہ جائے۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اقبالؔ عورت کو جاہل رکھنے کے مخالف ہیں۔ وہ اس کو تعلیم دلانا ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اس کی تعلیم کو وہ مرد کی تعلیم پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلہ میں اقبالؔ نہ مشرقی طریقہ کے حامی تھے اور نہ مغربی طرز کے۔ اقبالؔ نے اپنے نظریۂ تعلیمِ نسواں کو ضربِ کلیم کے ایک قطعہ میں پیش کیا ہے جس کا عنوان ''عورت اور تعلیم'' ہے:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن  بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن

ان اشعار میں اقبالؔ نے تعلیمِ نسواں سے متعلق اپنے نظریہ کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔ اس نظریہ کے دو اجزا ہیں: ایک تو یہ کہ ''مدرسۂ زن دین سے بیگانہ نہ رہے'' اور دوسرے یہ کہ عورت کو ایسی تعلیم نہ دی جائے جس سے وہ زن بننے کی بجائے ''نازن'' بن جائے۔ ''اقبالؔ کہتے ہیں کہ زن گھر والی ہے، شوہر والی ہے، اولاد والی ہے اور ''نازن'' خانہ برانداز چمن ہے، بے شوہر و بے اولاد۔ ''زن'' گھر کو اپنی جنت، شوہر کو اپنے سر کا تاج اور اولاد کو اپنے دل کا قرار اور روح کا گداز سمجھتی ہے اور ''نازن'' گھر کو قید خانہ، شوہر کو پاؤں کی بیڑی، گلے کا طوق اور اولاد کو جان کا جنجال اور روح کا وبال قرار دیتی ہے۔'' اس خیال کی تائید اکبرالہ آبادی کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر  خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

اقبالؔ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے آزاد یونیورسٹی کی بھی بات کرتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں آخری بار ''انجمن حمایت اسلام'' لاہور کے سالانہ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے جہاں یہ تجویز پیش کی کہ انجمن لڑکیوں کے لیے علیٰحدہ نصاب مرتب کرے اور اس میں امتحان لے، وہاں یہ بھی مشورہ دیا کہ انجمن پہلے ایک امتحان لینے والے ادارے کے طور پر کام شروع کرے اور پھر اسی ادارہ کو خواتین کی آزاد یونیورسٹی میں تبدیل کردے۔ (سید عبدالواحد معینی، مرتب: مقالاتِ اقبال)

○■○

# اقبال اورتعلیمِ نسواں

ابو ہریرہ خاں، ریسرچ اسکالر

تعلیمِ نسواں کی بحث کرنے سے پہلے حق بہ جانب ہوگا اگر ہم ایک طائرانہ نگاہ اقبال اوران کی تصورِ تعلیم پرڈال لیں۔اقبال کے خاندان کے ابتدائی نقوش تلاش کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے آباواجداد کا تعلق کشمیر کے سپرو برہمن سے تھا۔اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق تھے جن کے بڑے صاحبزادے شیخ نور محمد اقبالؔ کے والد تھے۔شیخ نور محمد کی شادی امام بی بی نامی خاتون سے ہوئی تھی۔اقبالؔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔کچھ سال پہلے تک ان کی سن پیدائش میں اختلاف پایا جاتا تھا۔مثلاً سید احتشام حسین نے اپنی کتاب ''اردوادب کی تنقیدی تاریخ'' میں اقبال کی سنِ پیدائش ۱۸۷۴ء بتائی تو منشی دین محمد فوقؔ نے اقبال کی پیدائش کا سال ۱۸۷۶ء قرار دیا۔لیکن سارے اختلافات دور ہوگئے جب ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب ''اقبال سب کے لیے'' میں لکھا کہ؛

> ''علامہ کی صحیح تاریخِ پیدائش ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء مطابق ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ ہے۔اس لیے کہ ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء کی تاریخ سارے اختلافات کے تحقیقی جائزے اور خاندانی وسرکاری دستاویز کی چھان بین کے بعد مقرر کی گئی ہے۔'' (اقبالؔ سب کے لیے، فرمان فتح پوری، ص:۱۰)

اقبال کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ کے اسکاچ مشن اسکول میں ہوئی جہاں ان کے استاد میر حسنؔ عربی اور فارسی کے استاد تھے پھر لاہور چلے گئے۔ان کا شمار درجے کے سب سے ہونہار طالب علموں میں ہوتا تھا۔فلسفے میں ایم۔اے۔کی ڈگری لے کر خصوصی تعلیم کے لیے لندن چلے گئے۔وہاں انھوں نے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔فلسفے میں ڈاکٹر آف فلاسفی انھوں نے جرمنی کے میونخ یونیورسٹی سے کی۔یورپ کے سفر نے ان کی زندگی پر ایک گہرا نقوش مرتب کیا جس کی وجہ سے ان کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔سیاست اور زندگی کے سبھی شعبوں میں ان کا نقطۂ نظر یکسر تبدیل ہوگیا۔وہاں سے لوٹنے کے بعد لاہور میں کچھ دنوں تک انھوں نے وکالت کی۔مگر یہ پیشہ ان کے عین مطابق نہیں تھا اس لیے وہ ایک کالج میں پروفیسر ہوگئے۔تھوڑا بہت پنجاب کی سیاست میں بھی انھوں نے حصہ لیا۔۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔اقبال کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی۔سال دوسالوں میں ان کی صحت بگڑتی چلی گئی اور اپریل ۱۹۳۸ء میں وہ اس دارِفانی سے رخصت ہوگئے۔فارسی اور اردو کی لازوال کتابیں انھوں نے چھوڑیں جیسے:''اسرارِ خودی''، رموزِ بےخودی''، ''پیامِ مشرق''، ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم''، ارمغانِ حجاز وغیرہ۔

تاریخی نقطۂ نظر سے اگر اقبال کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ان روایات کو آگے بڑھا رہے تھے جنھیں سرسید اور حالؔی کی اصلاح پسند تحریک نے جنم دیا تھا۔اردو کے سبھی شعرا کی طرح انھوں نے بھی شروع میں غزلیں لکھی تھیں اور انھوں نے اپنا کلام داغؔ دہلوی کو دکھایا تھا۔مگر تھوڑی مدت گزرنے کے بعد انھوں نے اپنی راہ خود نکالی اور ۱۸۹۹ء میں اپنی پہلی اور اہم نظم ''ہمالیہ'' لکھی۔اس کے بعد حسن فطرت، ہندو مسلم اتحاد اور زندگی کی داخلی کشمکش پر بڑی دلچسپ تخلیقات کیں۔ان میں ایک صاحبِ فکر انسان کا تدبر اور سنجیدگی موجود ہے جو کائنات کی ہر شے میں زندگی کے اسرار کو تلاش کرتا ہے۔تدبر و سنجیدگی نے انھیں اردو کا عظیم فلسفی شاعر بنایا۔

بنیادی طور پر اقبالؔ ایک فلسفی ہیں۔فلسفہ کا مطلب ہے اشیاء کی حکمت اور زندگی کے معنی تلاش کرنا۔یہ تلاش علم کی روشنی میں کی جاتی ہے۔تعلیم ایک علم ہے اور فن بھی اور اِس حیثیت سے وہ فلسفی کے لیے غور وفکر کا مواد مہیا کرتی ہے۔فلسفۂ حیات کا تعلق براہِ راست تعلیم سے ہے اس لیے اقبالؔ نے علم وتعلیم پر بھی نظر ڈالی ہے۔اقبالؔ اس مفہوم میں مفکرِ تعلیم ہیں اور نمو کی اُس عظیم روایت کے پاسدار ہیں جو ''بچے پر مرکوز تعلیم'' اور ''ترقی پسند تعلیم'' کی روحِ رواں ہے۔اقبالؔ نے فلسفۂ کائنات اور تصورِ حیات کی ترجمانی کی اور اس کی تشکیل وتکمیل کیلئے تعلیم کو اہم ذریعہ بنایا۔وہ جس طرح کا نظامِ حیات چاہتے تھے اس کے تعلیمی نظام کو اس سے مربوط دیکھنا چاہتے تھے۔اس سلسلے میں انھوں نے تعلیم کے مقاصد، تعلیمی تنظیم، اساتذہ کے کردار، طالب علم کی سیرت سازی، تدریسی ماحول، انفرادی اور اجتماعی زندگی سے تعلیم کا تعلق، قومی،

نئی دلّی میونسپل کونسل

# نئی دہلی پالیکا سماچار

☆ جلد......۳۶ ☆ شمارہ......۱۱-۱۲ ☆ دو ماہی ☆ نومبر-دسمبر ۲۰۱۳ء

## اس شمارہ میں

☆اداریہ☆


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ: | | | ۱ |
| تعارف: | | | ۲ |
| شخصیات وادبیات: | ''اقبالؔ اور تعلیمِ نسواں'' | ابو ہریرہ خاں، ریسرچ اسکالر | ۳ |
| | نشاط النسا بیگم: ایک اولوالعزم خاتون | احترام اسلام | ۵ |
| | حقیقت پسند افسانہ نگار: نورالامین | رئیس الدین رئیس | ۷ |
| | میر انیس کے کلام میں منظر نگاری | ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی | ۱۲ |
| کہانی: | راجہ بیٹا | بلوندر بالم | ۱۷ |
| خبرنامہ: | | ادارہ | ۱۹ |


## ❖ غزلیات ❖


رئیس الدین رئیس......۶
ڈاکٹر مسعود جعفری......۱۰
اطہر نیر......۱۱
منظور پروانہ......۱۴،۱۵
ڈاکٹر اظہار مسرت یزدانی......۱۵
اوج اکبر پوری......۱۶
سیدہ شان معراج......۱۷
ظفر علی ظفر......۱۷،۱۸
اطہر حسن اطہر، ''نیا آسمان'' (نظم)......۱۸
مناظر حسن شاہین......۱۹


''تحریروں میں اظہارِ خیال مصنفین کے اپنے ہیں۔ اِس سے ادارتی بورڈ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ مدیر کو اِن تحریروں میں اصلاح اور قطع و برید کا پورا حق ہے۔ اِن خیالات پر کسی طرح کے اعتراضات کا حق مصنفوں کا ہی ہے اور کسی بھی تنازعہ کا قانونی چارہ جوئی دلّی کی عدالت میں ہوگا۔'' (مدیر)

## ☆ ادارتی بورڈ ☆

جلد۳۶۔دوماہی۔شمارہ۔۱۱-۱۲نومبر/دسمبر/ ۲۰۱۳ء

سرپرست

**جلج شریواستو**

☆☆

چیف ایڈیٹر

**وکاس آنند**

☆☆

**ڈپٹی چیف ایڈیٹر**

اے کے مشرا

☆☆

انیتا جوشی

**ایڈیٹر و ناشر**

☆☆

**تعاون**

انیس فاطمہ

سنیتا بوہادیہ

آصف علی

☆☆☆

فی شمارہ -/20 روپیہ

سالانہ -/100 روپیہ

پانچ سال کے لیے-/400روپیہ

ترسیل زر کا پتہ: سکریٹری نئی دلی میونسپل کونسل پالیکا کیندر

پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی۔۱۱۰۰۰۱

خط وکتابت کا پتہ: ایڈیٹر پالیکا سماچار اردو شعبۂ اردو کمرہ ۱۲۰۹

پالیکا کیندر پارلیمنٹ اسٹریٹ نئی دلی۔۱۱۰۰۰۱

فون نمبر 70/3209 to 41501354


# اداریہ



(مدیر کے قلم سے) نومبر۔دسمبر ۲۰۱۳ء

بچے صرف ملک کی دولت ہی نہیں بلکہ مستقبل کے معمار بھی ہوتے ہیں۔اس لیے ہم سب کا اولین فریضہ بچوں کی ترقی پر مرکوز ہونا چاہیے۔ہمیں بچوں کی شخصیت کی ترقی پر زور دینا چاہیے کیوں کہ تعلیم یافتہ بچے ہی سماج کے تئیں آگاہ ہوکر عزت کے ساتھ ملک کو ترقی کی بلندیوں پر لے جا سکتے ہیں۔ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم اور بچوں کے پیارے چاچا نہرو نے ملک کے بچوں کی ترقی میں ہی ہندوستان کی ترقی کو دیکھا تھا۔بچوں کے لیے بنیادی تعلیم لازمی ہونے کے باوجود ملک میں کافی تعداد میں بچے آج بھی تعلیم سے محروم ہیں۔اس لیے ہم سب شہریوں کا فرض ہے کہ اُن بچوں کو تعلیم کی بنیادی حقوق دِلانے میں اپنا بھرپور تعاون دیں۔آج کے مقابلہ جاتی دَور میں جہاں ہر وقت نئے بدلاؤ ہو رہے ہیں وہاں بچے صرف تعلیم کے ذریعے سے ہی اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔

ہمارا ملک صوفی، سنتوں اور دانشوروں کی مخصوص زمین رہی ہے۔ہماری زندگی میں آنے والے تہوار گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہیں۔اِن تہواروں سے ہمیں کچھ نہ کچھ تحریک ملتی رہتی ہے۔نومبر و دسمبر مہینے میں ہلکی دھوپ کا مزہ اور نئے سال کے آنے کی خوشی سے دل مچل اُٹھتا ہے۔

گذرتے سال کو الوداع کہیں اور نئے سال کی آمد کو ایک نئی اُمنگ، امید اور عزم کے ساتھ خوش آمدید کہیں۔

**وکاس آنند**

**چیف ایڈیٹر**

"پالیکا سماچار اردو نئی دھلی"، میونسپل کونسل کے لیے انیتا جوشی نے شائع کیا اور نوتن پرنٹرس
F/89/12 اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیس 1، نئی دہلی110020 Tel.: 26817055